انیسویں صدی کا ہندوستان:
جدید مؤثر اسلامی تحریکات، ایک عصری تناظر

محمد عاصم قریشی

افغانی نژاد امریکی مصنف تمیم انصاری کی انعام یافتہ کتاب Destiny Disrupted: A History of the World Through Islamic Eyes برعظیم میں مسلمانوں کے دورِ زوال اور نوآبادیاتی ہندوستان میں اسلامی تحریکات کے حوالے سے اہمیت کی حامل ہے۔تصنیف وتالیف کے میدان میں مصنف مذکور کی دل چسپیاں ان موضوعات میں ہیں: تاریخ، یادداشتیں، فکشن نگاری، سیاست، کھیل، فنون، فلسفہ اور مضمون نگاری۔

وہابی تحریک، علی گڑھ تحریک اور اسلامی جدیدیت کی تحریک نے برعظیم کے مسلمانوں پر وقیع اثرات مرتب کیے ہیں۔یہ تحریکیں اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی میں برپا ہوئیں۔ان کے روح رواں علی الترتیب جزیرہ نما عرب میں عبدالوہاب، علی گڑھ میں سرسید احمد خان اور جمال الدین افغانی تھے۔برعظیم میں ان تحریکات کے اثرات کی بدولت یہ ناگزیر ہے کہ ان کے بارے میں تمیم انصاری جیسے مصنف کا نقطۂ نظر بھی سامنے آئے جس کے لیے مذکورہ کتاب سے درج ذیل معلومات کشید کی گئی ہیں:

برعظیم میں ان تحریکات نے جو موقف اختیار کیا اس کی صراحت یہ ہے کہ اسلام کو نہیں بل کہ مسلمانوں کو تبدیل ہونے کی ضرورت ہے۔بدعات، خرافات اور بیرونی اثرات نے ایمانیات کے دائرے میں جو بگاڑ پیدا کیا ہے، اس ضمن میں مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ مغربی اثرات کو اپنی زندگی سے بے دخل کریں اور اسلام کو اس خالص شکل میں اختیار کریں جس کا وہ ہم سے تقاضا کرتا ہے۔

دوسرا زاویہ نظر یہ تھا کہ مغرب اپنی جگہ درست ہے۔یہ مسلمان ہیں جو دقیانوسی خیالات کے حامل ہیں۔اسلام ایسے جاہل مذہبی رہنماؤں کے سپرد ہے جو بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔اسلام کو توہمات سے نکال کر جدید مغربی خطوط پر لانے کی ضرورت ہے تاکہ اسلام کو ایسے اخلاقی نظام کے طور پر پیش کیا جائے جو جدید سائنس اور دیگر نظاموں سے ہم آہنگ ہو۔

ان حالات میں تیسرا تصور یہ پیش کیا گیا کہ بے شک اسلام ایک سچا دین ہے، لیکن مسلمانوں کو مغرب سے بہت کچھ سیکھنے کی ضرورت ہے۔ مسلمان اپنے دین، تاریخ اور روایات کے بنیادی جواہر کو دوبارہ دریافت کریں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں مغرب سے استفادہ کریں۔ مسلمان اپنی روایات میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو جدید بنائیں، یعنی جدیدیت کا مطلب ہرگز مغربیت نہیں ہے۔

وہابی تحریک:

عبدالوہاب نجد کے مقام پر ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک قاضی تھے۔ مدرسے کی تعلیم کے دوران ہی انھیں ابن تیمیہؒ کی تعلیمات سے متعارف کروادیا گیا تھا۔ ابن تیمیہ یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں میں اسلام کی روح سے دوری کی اصل وجہ منگولوں کے ہاتھوں ان کا قتلِ عام اور تباہی تھا۔ اگر مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ وہ اپنے رب کا فضل دوبارہ حاصل کرلیں تو انھیں لازماً قرنِ اوّل کی طرف پلٹنا ہوگا۔ عبدالوہاب ان ہی خیالات سے متاثر ہوئے۔

عبدالوہاب خلیج فارس میں واقع کثیر ثقافتی مظاہر کے حامل شہر بصرہ میں پہنچے جہاں متنوع آراء اور نظریات کا اس وقت بہت شور تھا اور قرآن حکیم کے الفاظ کی متعدد شرحیں موجود تھیں۔ عبدالوہاب کے خیال میں یہی وہ غیر فطری انداز تھا جو اسلام کو کمزور کر رہا تھا۔ بصرہ سے وہ اپنے ریگستانی آبائی قصبے کو پلٹے جہاں انھوں نے احیاء اسلام کی تحریک شروع کی یعنی خدا صرف ایک ہے اور اللہ کی عبادت صرف اُسی طرح کی جانی چاہیے جیسے کتاب مقدس یعنی قرآن حکیم میں ہدایت کی گئی ہے۔ ہر شخص کے لیے لازمی ہے کہ وہ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی مدنی زندگی کو اپنے لیے نمونہ بنائے اور اس راہ میں جو بھی رکاوٹ ہو اسے ہٹادیا جائے۔ عبدالوہاب کے گرد لوگ جمع ہونے لگے۔ عبدالوہاب کا عقیدہ تھا کہ ''خدا کے سوا کسی بھی چیز یا شخص کی تعظیم بُت پرستی میں شمار ہوتی ہے''۔ لہٰذا ان سے عقیدت رکھنے والے افراد نے اطراف میں موجود مزارات و مقابر کو مسمار کرنا شروع کردیا۔

عبدالوہاب کو سیاسی قوت ایک مقامی حاکم محمد ابن سعود سے ملی۔ ابن سعود ایک معمولی قبیلے کا سربراہ تھا جس کی خواہشات میں یہ بھی شامل تھا کہ جزیرہ نما عرب کا اتحاد ہو یعنی عربوں پر حکومت کی جائے۔ مبلّغ عبدالوہاب کی صورت میں اُسے اپنی خواہشات پوری ہوتی نظر آئیں۔ دونوں میں معاہدہ ہوا۔ ابن سعود نے عبدالوہاب کو مسلمانوں کا مذہبی رہنما تسلیم کرلیا اور جواب میں عبدالوہاب نے ابن سعود کو مسلمانوں کا سیاسی رہنما مان لیا۔ معاہدے کے اثرات سامنے آنا شروع ہوگئے۔ اگلے چند عشروں میں جزیرہ نما عرب کے تمام بدوی قبائل کو سعودی وہابی حکومت کے زیر نگیں کردیا گیا۔ جب کبھی ان کا واسطہ کسی ضدی قبیلے سے پڑتا تو وہ اسے عقائد بدلنے کا کہتے۔ وہ تین دفعہ چلّاتے ''اپنے عقائد بدلو! اپنے عقائد بدلو! اپنے عقائد بدلو''۔ اگر تین دفعہ دیا گیا یہ انتباہ نظر انداز کردیا جاتا (جو کہ عموماً ہوتا تھا) تو عبدالوہاب سپاہیوں سے کہتے کہ وہ آگے بڑھیں اور ان لوگوں کو قتل کردیں۔ اللہ نے اس کی اجازت دی ہے کیوں کہ یہ کافر ہیں۔

عقائد بدلنے کی اس دعوت نے قبائل کو متذبذب کر دیا۔ کیوں کہ وہ تو اب تک اپنے آپ کو سچا مسلمان سمجھتے آئے تھے۔ عبدالوہاب نے اپنی تحریک کو ''وہابیت'' نہیں کہا، کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ وہ مسلمانوں کو اصل اور خالص اسلام کی طرف بلا رہے ہیں۔ جو لوگ ان کی آراء سے متفق نہیں تھے انھوں نے اسے محض اسلام کی ایک تعبیر سمجھا، اسلام نہیں۔ اور انھوں نے ہی اس نظریے کو ''وہابیت'' کا نام دیا۔

۱۷۶۶ء میں ابن سعود کو قتل کر دیا گیا۔ ان کے بیٹے عبدالعزیز نے اپنے باپ کے مشن کو جاری رکھا۔ ۱۷۹۲ء میں عبدالوہاب کا بھی انتقال ہو گیا۔ عبدالعزیز ابن سعود نے ان کے جانشین ہونے کا اعلان کر دیا اور یوں امارت کے ساتھ ساتھ مذہبی رہنمائی کا مرتبہ بھی حاصل کر لیا۔ عبدالوہاب کا انتقال ہو گیا لیکن وہابی عقائد زندہ رہے۔ عبدالوہاب کی تعلیمات دو بنیادی عقائد پر قائم تھیں: توحید کی اہمیت اور شرک سے بچنا۔

پیغمبر محمد ﷺ کی مدنی زندگی اور ابتدائی تین خلفاء کا دور مثالی معاشرہ تھا۔ اسی وجہ سے یہ معاشرہ پھلا پھولا اور اس نے دنیا پر غلبہ بھی حاصل کیا۔ لہٰذا مدنی معاشرہ ہی وہ نمونہ ہے جس کو دوبارہ پیدا کرنا ہی امت کا مقصد ہے۔ اور جو بھی اس راہ میں رکاوٹ ہوں وہی دشمنِ اسلام ہیں اور یہ دشمنِ اسلام کون تھے؟ وہابی نظریہ کے مطابق جو اسلام پر یقین نہیں رکھتے وہ ممکنہ دشمن تو ہیں لیکن اگر وہ اسلامی حکومت میں پُرامن طور پر رہنا چاہیں تو انھیں برداشت کیا جا سکتا ہے۔ اصل دشمن تو مرتد، منافقین اور بدعتی ہیں۔ ان کے نزدیک سب سے بُرے بدعتی تھے۔ یہ وہ مسلمان تھے جو اسلام کی اصل شکل کو آلودہ کر رہے تھے یا مذہب میں وہ رسوم داخل کر رہے تھے جن پر پیغمبر یا ان کے اصحاب نے کبھی عمل نہیں کیا۔ ان کے نزدیک شیعہ اور صوفی اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے خلاف جہاد جائز ہی نہیں بلکہ فرض تھا۔

علی گڑھ تحریک: جدیدیت کا مظہر

سید احمد یا سر سید احمد نے انیسوی صدی کی اسلامی دنیا کے متعدد حصوں میں آزادی کے نام پر رونما ہونے والے فکری رویے کی نمائندگی کی۔ انھوں نے اسلام کو ایسے اخلاقی نظام کے طور پر پیش کیا، جو اپنی روح اور روایت سے تو جڑا ہو لیکن ساتھ ہی یورپی فکر سے مغلوب اور دنیا سے ہم آہنگ بھی ہو۔

سید احمد ۱۸۱۷ء میں دہلی کے ایک معروف مسلمان خاندان میں پیدا ہوئے۔ ان کے اجداد مغل دربار میں اہم عہدوں پر فائز تھے۔ سر سید کو جو دور ملا اس میں ہندوستان پر برطانوی گرفت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ سید احمد کے خاندان نے اپنے آپ کو نئے نظام کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ ان کے دادا نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔ ان کے لیے اسکول قائم کیا اور برطانوی نمائندے کی حیثیت سے ایران کا سفر کیا۔ سید احمد کے والد نے بھی کمپنی کے لیے کام کیا اور ان کے بھائی نے انڈیا کا پہلا اردو اخبار نکالا۔ مختصر یہ کہ سید احمد کا تعلق ایک ایسے طبقے سے تھا جو جدیدیت اور مغربیت پر مائل تھا۔

ان کی والدہ ایک روایتی متقی خاتون تھیں۔ انھوں نے سید احمد کو مدرسے بھیجا اور ساتھ ہی یہ کوشش بھی کی کہ وہ اپنے دادا کے زیر اثر بھی رہیں۔ لہٰذا وہ ان دہرے اثرات کے ساتھ ساتھ بڑے ہوئے۔ ایک طرف مسلمانوں سے دلی لگاؤ اور دوسری طرف برطانوی راج اور کلچر کی تکریم۔

بدقسمتی سے والد کے انتقال کے بعد ان کا خاندان مالی مشکلات کا شکار ہو گیا اور انھیں پڑھائی ترک کر کے کام پر لگنا پڑا۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی میں بطور کلرک ملازم ہو گئے اور ترقی کرتے ہوئے سب جج بن گئے۔ تاہم کمپنی کے عدالتی نظام میں یہ ایک معمولی عہدہ تھا۔ تعلیم نامکمل رہ جانے کی وجہ سے وہ زیادہ ترقی نہیں کر سکے۔ مطالعہ کے وہ رسیا تھے، جو ہاتھ لگا پڑھ ڈالا۔ انگریزی ادب، سائنس سب کچھ۔ اپنے ہندوستانی مسلمان دوستوں کے ساتھ مل کر انھوں نے مطالعے اور مباحثوں کے حلقے بنائے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ میں انھوں نے برطانویوں کا ساتھ دیا لیکن بعد میں 'اسباب بغاوت ہند' کے عنوان سے ایک کتابچہ لکھا جس میں برطانوی انتظامیہ کی فروگذاشتوں پر سرزنش کی گئی تھی۔ یہ کتابچہ انھوں نے کلکتہ اور لندن میں موجود برطانوی اہلکاروں کو بھیجا۔ اس کے بعد انھوں نے ایک اور مختصر کتاب تحریر کی جسے ایک برطانوی کرنل نے انگریزی میں ترجمہ بھی کیا جس میں انھوں نے مسلمانوں کو ملکہ برطانیہ کی انتہائی وفادار رعایا ثابت کرنے کی کوشش کی۔ ان کا موقف تھا کہ برطانیہ کے خلاف مسلمانوں کے جہادی عزائم نہیں ہیں۔ انھوں نے علمی اور مذہبی مآخذ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ برطانیہ کے خلاف جہاد جائز نہیں ہے کیوں کہ برطانیہ نے مسلمانوں کے دین میں نہ تو کوئی مداخلت کی ہے اور نہ ہی کوئی رکاوٹ کھڑی کی ہے۔

انگلستان کے دورے نے ان پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ ہندوستانیوں کی پسماندگی ان پر اب مزید ظاہر ہونے لگی۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ مسلمانوں کی اس پسماندگی کی کیا وجہ ہے؟ مسلمانوں کو اس حالت سے کیسے نکالا جا سکتا ہے؟ بالآخر سید احمد نے یہ فیصلہ کیا کہ موجودہ دور میں مسلمان اسلام کی جو تعبیر کر رہے ہیں یہ درست ہیں۔ مسلمان توہمات میں گھرے ہوئے تھے اور ان ہی قبیح صورتوں کو اسلام سمجھتے تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ مذہب انسانی تحقیق و جستجو کے لیے ایک فطری میدان کی طرح ہے۔ اس کا ارتقاء نوعِ انسانی کے طرح فطری انداز میں ہوا جیسا کہ فنون، زراعت اور ٹیکنالوجی کے شعبہ جات میں ہوتا ہے۔ جوں جوں انسان مہذب ہوا ہے، اس نے ترقی کا سفر طے کیا ہے۔ سید احمد کا کہنا تھا کہ پرانے وقتوں میں اخلاقیات کو سمجھنے کے لیے انسان کی ذہنی صلاحیت کم تھی۔ لہٰذا اخلاقی رہ نمائی کے لیے انھیں الہامی مذاہب کی ضرورت تھی۔

تمام عظیم مذاہب کی تعلیمات غیر عقلی نہیں ہیں اور جب لوگوں میں عقلی استعداد پیدا ہو جائے تو ان تمام اخلاقی تعلیمات کو عقل کے ذریعے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ اسی لیے حضرت محمد ﷺ نے فرمایا کہ پیغمبروں میں وہ سب سے

آخری ہیں لیکن ان کا یہ مطلب نہیں تھا کہ ان کے وہ احکام جو اس دور کے مکے اور مدینے کے لیے تھے وہ آنے والے ادوار کے انسانوں کے لیے حرفِ آخر ہیں۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ انھوں نے وہ طریقے ضرور متعارف کروائے ہیں جن کو انسان بغیر کسی الہامی تعلیم کے اخلاقی معاشرے کی تلاش کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ الہامی مذاہب میں اسلام آخری مذہب تھا کیوں کہ یہ عقلیت پسند مذاہب کا نکتہ آغاز تھا۔ عقلیت پسند افراد قابل بھروسا بنیادی اصولوں سے استدلال کر کے اخلاقی برتری حاصل کر سکتے ہیں اور اسلام نے ان بنیادی اصولوں ہی کو پیش کیا ہے۔ یہ وہی اصول ہیں جو عیسائیت سمیت تمام الہامی مذاہب میں پائے جاتے ہیں۔ یہی چیز انسانیت کو توہمات و عقائد کی اندھی تقلید سے نجات دلا سکتی تھی۔

سید احمد کے مطابق مسلمان، جنت و دوزخ اور معجزات کے تصورات سے باہر نکلیں۔ اس طرز احساس کے مطابق ضروری نہیں تھا کہ اچھا مسلمان وہ کہلائے جو ہر دن کئی گھنٹے قرآن کی عربی میں تلاوت کرے، مخصوص طرز کا لباس پہنے وغیرہ۔ اچھے مسلمان کی تعریف یہ ہوگی کہ وہ جھوٹ نہ بولے۔ چوری، جعل سازی یا قتل نہ کرے، دوسروں سے اچھا سلوک کرے، معاشرہ میں انصاف کا طلب گار ہو، رحم و درگزر کرے اور مقدور بھر بھلائی کے کاموں میں حصہ لے۔

انگلستان روانگی سے قبل انھوں نے علی گڑھ میں ایک ادارہ قائم کیا تھا جو سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے بھی معروف ہے۔ یہ ادارہ خطبات کا بھی اہتمام کرتا تھا اور اس کے دیگر کاموں میں اردو، فارسی میں یورپی علوم کی کتابوں کے تراجم کرنا شامل تھا تاکہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ان معلومات تک رسائی ممکن ہو سکے۔ انگلستان سے واپسی کے بعد سید احمد نے اس ادارے کو یونی ورسٹی کی شکل میں ترقی دی۔ وہ اس کو اسلامی دنیا کی کیمبرج بنانا چاہتے تھے۔ مذہبی اور روایتی علوم کے علاوہ یونی ورسٹی کے نصاب میں فزکس، کیمسٹری، بیالوجی اور دوسرے 'جدید' علوم شامل تھے۔ اگرچہ بہت سارے ہندوستانی علماء نے سید احمد کے نظریات پر تنقید کی، تاہم یونی ورسٹی ترقی کرتی گئی اور اس کے طلبہ میں اضافہ ہوتا گیا۔ یونی ورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ نے بیسویں صدی میں جس سیکولر تحریک کا بیج بویا اس نے مسلمانوں کو یہ تحریک دی کہ وہ ہندوستان سے الگ ہو کر اپنی ایک قومی ریاست تشکیل دیں اور بالآخر یہ تحریک علیحدہ ملک پاکستان کی شکل میں منتج ہوئی۔

سید احمد کے مخصوص خیالات کو قبول عام تو نہ ملا لیکن دوسرے مسلمان ملکوں کے جدید اذہان کے دانش ور اِن ہی خطوط پر سوچ کر ایسے ہی نتائج اخذ کر رہے تھے۔ ایران میں قاچاری شاہوں کے ایک وزیر اعظم نے ایک اسکول قائم کیا جو دارالفنون کہلاتا تھا۔ یہ اسکول ادب، فلسفہ اور تمام مغربی علوم کی تعلیم فراہم کرتا تھا۔ اس اسکول کے فارغ التحصیل طلبہ نے ایرانی معاشرے کو جدید فکر سے روشناس کرایا جس سے معاشرے کی یورپی طرز پر تشکیلِ نو کرنے کی راہ ہم وار ہوئی۔ انیسویں صدی کے آخر میں اسی طرح کے جدید اذہان عثمانی سلطنت کے قلب میں متحرک تھے۔ انیسویں صدی کے آخر میں جدید فکر سے متاثر عثمانی حکومت کے اس طبقے نے 'تنظیمات' یا 'ریفارمز' کو فروغ دیا۔ ان اصلاحات میں یورپی طرز کے اسکولوں کا قیام، یورپی انداز میں حکومتی نظم و نسق اور افواج کی تشکیلِ نو، سپاہیوں کے لیے یورپی انداز کے یونی فارم اور

حکومتی اہلکاروں کے لیے یورپی انداز کے لباس پہننے کی حوصلہ افزائی وغیرہ شامل تھی۔

اسلامی جدیدیت

انیسویں صدی کے نہایت اثر انگیز مسلمان مصلح سید جمال الدین افغانی ۱۸۳۶ء میں کنر کے ایک قصبے اسد آباد میں پیدا ہوئے۔ افغان حکمران قبیلے سے ان کے خاندانی مراسم تھے۔ افغانی ابھی کم سن ہی تھے کہ ان کے خاندان کو ایران منتقل ہونا پڑا۔ اٹھارہ سال کی عمر میں انھوں نے ہندوستان کا پہلا سفر کیا۔ اس دوران انھوں نے مشاہدہ کیا کہ وہاں انگریزوں کے خلاف لاوا پک رہا ہے۔ وہ حج کے لیے مکہ میں تھے جب جنگِ آزادی برپا ہوئی۔ جب وہ انڈیا واپس ہوئے تو انھوں نے خود انگریزوں کی انتقامی کارروائیوں کا مشاہدہ کیا اور یہیں انھیں انگریزوں اور یورپی سامراج سے زندگی بھر کے لیے نفرت ہوگئی۔ ان حالات میں انھوں نے ہندوستان سے افغانستان کا رُخ کیا۔ یہاں انھیں شاہ کا اعتماد حاصل ہوگیا اور وہ بادشاہ کے سب سے بڑے بیٹے کے اتالیق مقرر ہوئے۔

جمال الدین پہلے ہی اس سوچ کے حامل تھے کہ مسلمانوں کی طاقت اور وقار کی بحالی کے لیے اسلام کو جدید خطوط پر استوار کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کو ایسا لگا کہ ولی عہد کی اتالیقی ان کو یہ موقع فراہم کر رہی ہے کہ وہ مستقبل کے حکمران کے کردار و عمل کو اس طرح ڈھال سکیں گے کہ مسلمانوں کا کھویا ہوا وقار بحال ہو سکے۔ لہٰذا انھوں نے ولی عہد اعظم خان کی اس طرح تربیت کی کہ وہ اصلاحات کے ذریعے افغانستان کو جدید تقاضوں کے مطابق ڈھال سکے۔ بدقسمتی سے اعظم خان تھوڑے عرصے ہی حکمران رہا۔ انگریزوں کے ساتھ مل کر ان کے ایک کزن نے سازش کی اور ان کا تختہ الٹ دیا۔ اس اثنا میں جمال الدین بھی ملک چھوڑنے پر مجبور ہوگئے اور انھوں نے ایشیا کوچک کا رُخ کیا۔ قسطنطنیہ یونی ورسٹی میں انھوں نے تقاریر کے سلسلے کا آغاز کیا۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کو جدید علوم سیکھنے کی ضرورت ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی لازم ہے کہ ان کے بچے اسلامی اقدار، روایات، تاریخ سے مضبوطی سے جڑے رہیں۔

ان کا پیغام تھا کہ جدیدیت کا مطلب مغربیت ہرگز نہیں ہے۔ یہ پیغام عوام و خواص دونوں طبقوں میں مقبول ہوا، ساتھ ہی انھوں نے اس پر بھی اصرار کیا کہ عوام کو یہ آزادی ہونی چاہیے کہ وہ علماء کی 'رہ نمائی' کے بغیر خود ہی قرآن حکیم کی تشریح کر سکیں۔ قدرتی طور پر یہ بات علماء کی ناراضی کا سبب بنی اور انھیں وہاں سے بے دخل ہونا پڑا۔ لہٰذا ۱۸۷۱ء میں وہ مصر جا پہنچے اور جامعہ الازہر میں لیکچر دینا شروع کر دیے۔ مصر میں اُس وقت برطانوی و فرانس کی حمایت یافتہ محمد علی کی حکومت تھی۔ جمال الدین افغانی نے طبقہ امرا کی بدعنوانیوں پر تنقید کی۔ انھوں نے کہا کہ حکمرانوں کو ابتدائی مسلم معاشرے کی طرح سادہ زندگی بسر کرنا چاہیے۔ انھوں نے پارلیمانی جمہوریت کا مطالبہ کیا لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی دہرائی کہ جمہوریت کا مقصد مغربیت نہیں ہونا چاہیے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اسلامی طرز کی جمہوریت کی بنیاد شوریٰ اور اجماع پر قائم کی جا سکتی ہے۔ تاہم انھوں نے ان تصورات کی از سرِ نو تشریح کی اور ان کا دائرہ کار بڑھاتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا کہ

عوام کی حمایت کے بغیر حقِ حکمرانی قانونی نہیں ہوسکتی۔

جمہوریت کے بارے میں ان کے موقف نے بادشاہ کو پریشان میں مبتلا کر دیا۔ بالائی طبقات بھی ان کی نکتہ چینی کی وجہ سے ان سے ناراض ہو گئے اور انھیں مصر سے نکلنا پڑا۔ اب پھر وہ انڈیا کی جانب گئے۔ یہاں سید احمد کی 'علی گڑھ تحریک' پھل پھول رہی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر جمال الدین کو ایسا تاثر ملا کہ سید احمد انگریزوں کی چاپلوسی پر مائل اور ان کے زیر اثر ہیں۔ یہی بات انھوں نے اپنی کتاب ''مادیت پسندوں کا رد'' میں بھی لکھی۔

انگریزوں کو سید احمد کے تصورات پسند تھے۔ جب مصر میں بغاوت ہوئی تو انگریزوں نے یہ دعویٰ کیا کہ جمال الدین اس کے محرک ہیں اور اسی الزام کی بناء پر انھیں چند مہینوں کے لیے جیل میں ڈال دیا گیا۔ جب بغاوت ختم ہوئی تو انھیں رہائی تو میسر آ گئی لیکن ہندوستان سے انھیں بدر کر دیا گیا۔ ۱۸۸۲ء میں وہ پیرس چلے گئے وہاں مختلف جرائد کے لیے انھوں نے لکھنا شروع کر دیا۔ ان کے مضامین انگریزی، فرانسیسی، فارسی، عربی اور اردو میں چھپنے شروع ہو گئے۔ ان تمام زبانوں میں وہ نہ صرف روانی سے گفتگو کر سکتے تھے بلکہ فصاحت و بلاغت سے لکھتے بھی تھے۔

ان کا موقف تھا کہ بنیادی طور پر اسلام ایک عقلیت پسند مذہب ہے اور یہ مسلم علماء اور مطلق العنان حکمران ہیں جو سائنسی ترقی کی راہ میں حائل رہے۔ ٹھیک اسی دور میں ایک فرانسیسی فلسفی ارنسٹ رینن (Ernest Renan) یہ لکھ رہا تھا کہ مسلمان جبلی طور پر سائنسی طرزِ فکر سے عاری ہیں۔ (اسی فلسفی کا یہ قول ہے کہ چینی ان کاموں میں ممتاز ہیں جن میں دستی مہارت کا عمل دخل ہوتا ہے۔ یہودی 'نامکمل' ہیں۔ سیاہ فام قومیں بہترین کھیتی کی طرح ہیں۔ یورپین قدرتی طور پر سپاہی ہیں اور حکمرانی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا اگر سب لوگ اپنا اپنا کام کریں تو یہ ساری دنیا کے حق میں بہتر ہوگا۔)

اس موضوع پر جمال الدین کا رینن سے ایک مناظرہ بھی ہوا۔ جمال الدین اور ان کے مصری شاگرد محمد عبدہٗ نے پیرس سے ایک رسالے کا اجرا کیا جس میں اتحادِ اسلامی کے تصور کی بنیاد رکھی گئی۔ انھوں نے اعلان کیا مسلمانوں اور یورپی طاقتوں کے درمیان بظاہر ایسے مقامی تنازعات ہیں: آذربائی جان پر ایرانی/روسی تنازعہ، کریمیا پر عثمانی/روسی تنازعہ، بینکوں کے قرضوں پر مصری/برطانوی تنازعہ وغیرہ۔ یہ سب مظاہر دراصل اسلام اور مغرب کے درمیان دوری کا باعث ہیں۔ اسی دوران وہ چند مرتبہ لندن گئے جہاں مصر سے متعلق برطانوی پالیسیوں پر ونسٹن چرچل کے والد رینڈولف چرچل اور دیگر برطانوی لیڈروں سے ان کا مکالمہ ہوا۔ اب وہ ازبکستان روانہ ہوئے، یہاں انھوں نے زارِ سلطنت کے اہلکاروں کو رضامند کیا کہ انھیں مقامی مسلمانوں کے لیے قرآن حکیم شائع کرنے اور انھیں تقسیم کرنے کی اجازت دی جائے۔ ساتھ ہی دیگر اسلامی لٹریچر کو بھی ترجمہ کر کے شائع اور تقسیم کرنے کی اجازت دی جائے کیوں کہ یہاں کئی عشروں سے یہ سب کچھ میسر نہیں۔ ان کوششوں سے خطے میں اسلام کے احیا میں مدد ملی۔ یہاں انھوں نے اس تصور کو بھی فروغ دیا کہ مسلمان ممالک اپنی آزادی کو یقینی بنانے کے لیے حریف یورپی طاقتوں کی رقابتوں کو اپنے حق میں استعمال کریں۔

۱۸۸۴ء میں انھوں نے ایران کا سفر اختیار کیا۔ یہاں انھوں نے عدالتوں میں اصلاحات پر کام کا آغاز کیا۔ یہ سب کچھ مقامی علما سے ان کے تنازع کا سبب بنا جس کے بعد انھیں وسطی ایشیا واپس جانا پڑا۔ ۱۸۸۸ء میں ایران کے بادشاہ نصیرالدین نے انھیں ایران میں بطور وزیراعظم دوبارہ آنے کی دعوت دی۔ اس دور میں نصیرالدین اور ایرانی علما میں طاقت کے حصول کے لیے کھینچا تانی ہو رہی تھی۔ لہٰذا بادشاہ نے سوچا کہ ان حالات میں جمال الدین کا جدیدیت کا نظریہ مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ جمال الدین ایران آ گئے لیکن بطور وزیراعظم نہیں، بلکہ بادشاہ کے خصوصی مشیر کے طور پر۔ اس دفعہ انھوں نے علما کو نشانہ نہیں بنایا بلکہ خود بادشاہ پر تنقید کی جو نوآبادیاتی طاقتوں کو معاشی فائدے پہنچانے میں مصروف تھا اور اس کی سب سے بڑی مثال تمباکو کی پیداوار اور فروخت پر مکمل برطانوی کنٹرول تھا۔

جمال الدین نے تمباکو کی مخالفت کی اور یہ وہ حکمت عملی تھی جو مختلف نوآبادیات میں بعد میں کئی سیاسی کارکنوں نے اختیار کی۔ مثلاً نوآبادیات کے ایک بڑے مخالف لیڈر مہاتما گاندھی نے انگریزی کپاس کی مخالفت کی۔ جمال الدین کی تقریروں سے ایران بھر میں شاہ مخالف مظاہرے شروع ہو گئے۔ بالآخر شاہ نے ان کو ملک بدر کروا دیا اور یوں ۱۸۹۱ء میں جمال الدین استانبول واپس ہوئے۔ یہاں عثمانی خلیفہ سلطان حمید نے انھیں رہائش اور مشاہرہ فراہم کیا۔ سلطان کا خیال تھا کہ جمال الدین کے اسلامی اتحاد کے تصورات اسے سیاسی فائدہ پہنچائیں گے۔ جمال الدین سے تمام اسلامی دنیا کے دانش ور اور تحریکوں کے کارکنان ملنے آتے رہے۔ وہ انھیں بتاتے کہ اجتہاد اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ہے لیکن اسے قرآن وسنت سے ہی ماخوذ ہونا چاہیے۔ ہر مسلمان کو حق ہے کہ وہ ان صحیفوں کی خود تعبیر کرے، تاہم مسلمانوں کو اُن علوم میں مہارت حاصل کرنا ہوگی۔ وہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کی سب سے بڑی غلطی اور ان کی کمزوری کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے مغربی تعلیمی اور سماجی طریقے تو اپنا لیے مگر مغربی علوم سے پیٹھ پھیر لی جب کہ انھیں اس کے برعکس کرنا چاہیے تھا یعنی مغربی علوم کو اپناتے اور مغربی سماجی رویوں اور تعلیمی نظام کو رَد کر دیتے۔

بدقسمتی سے ۱۸۹۵ء میں ایک ایرانی طالب علم نے شاہ نصیرالدین کو قتل کر دیا۔ ایرانی حکومت نے اس قتل کا الزام فوراً جمال الدین پر لگا دیا اور مطالبہ کیا کہ سزا کے لیے انھیں ایران کے حوالے کیا جائے۔ سلطان حمید نے یہ مطالبہ تو ماننے سے انکار کر دیا لیکن جمال الدین کو ان کے گھر میں قید کر دیا گیا۔ اسی سال کے آخر میں انھیں منہ کا کینسر ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے ان کا نچلا جبڑا نکال دیا۔ اسی مرض میں ان کا انتقال ہو گیا اور انھیں وہیں دفن کر دیا گیا۔ بعد میں ان کی میت دوبارہ تدفین کے لیے افغانستان لائی گئی۔ ان کی قبر کابل یونی ورسٹی کے کیمپس کے قلب میں واقع ہے۔

دل چسپ بات یہ ہے کہ سید جمال الدین افغانی کے پاس کوئی سرکاری خطاب یا عہدہ نہیں تھا۔ انھوں نے نہ تو کسی ملک پر حکمرانی کی تھی اور نہ ان کے پاس کوئی فوج تھی۔ انھوں نے کبھی کوئی سیاسی پارٹی بھی نہیں بنائی نہ ہی کسی تحریک کی قیادت کی، نہ ہی ان کے ملازمین یا ماتحت تھے جنھیں وہ احکامات دیتے۔ اس پر مستزاد یہ کہ انھوں نے اپنے سیاسی فلسفے پر

کوئی کتاب بھی نہیں چھوڑی۔ درحقیقت وہ لوگوں کو سماجی تبدیلی پر اکسانے والے ایک باغی تھے۔ اسلامی دنیا پر ان کی شخصیت اور افکار کے اثرات مرتب ہوئے۔ ان کے شاگردوں نے ان کے مشن کو آگے بڑھایا۔ مصر کے محمد عبدہٗ، جو مصر کے چوٹی کے عالم اور جامعہ ازہر کے سربراہ بنے، جمال الدین کے جدیدیت کے تصورات کو اپنی کتابوں کے ذریعے فروغ دیا۔ ان کے دوسرے شاگرد زغلول نے ایک سیاسی پارٹی کی بنیاد رکھی جو مصر کی آزادی کے لیے ایک قومی تحریک بن گئی۔ ان کے شاگردوں کے مزید شاگرد دنیا میں سامنے آئے۔ ان کا پیغام جیسے جیسے عام ہوا، اس میں تبدیلی بھی آتی گئی۔ کچھ انقلابی سیاسی بن گئے کچھ مزید قومیت پسند ہو گئے، کچھ ترقی پسند ہو گئے۔ محمد عبدہٗ کے شاگرد شامی عالم رشید رضا نے حکومتی معاملات میں اسلامی تعلیمات کی اہمیت کو واضح کیا۔ جمال الدین کے دانش ور تلامذہ میں سے ایک حسن البنا بھی تھے جنھوں نے اخوان الصفاء کی بنیاد رکھی۔ مختصر یہ کہ ان کی شخصیت کے اثرات مسلم دنیا کے کونے کونے میں محسوس کیے جاتے ہیں۔

Abstract

An Afghan Muslim author Tamim Ansari based in America focused Muslim reformers of their times Abdul Wahab, Sir Syed Ahmed Khan and Jamaluddin Afghani in his work Destiny Disrupted: A History of World through Islamic Eyes. The work is meant to highlight their struggles against the internal and external threats. The writer of the work briefly explains the character of their Islamic projects widely known as Wahabi movement, Aligarh movement and Islamic modernism. Their religious and political struggles are against their own people and the repressive European powers. This piece of writing also covers their brief biographies of the reformers. This also discusses some of the little highlighted issues of their reforms.

Keywords: Wahabi movement, Aligarh movement, Islamic modernism, repressive European powers, internal threats, external threats